"افراط زر" اور "قیمتوں کی سطح میں بلندی" دو مختلف چیزیں ہیں

بسلسلہ "ایک اہم اقتصادی مسئلہ اور اس کا حل" (۴)

(حافظ) عاطف وحید

ماہ جون ۹۶ء کے حکمت قرآن میں مولانا طاسین صاحب کی ایک تحریر بعنوان "ایک اہم اقتصادی مسئلہ اور اس کا حل" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ جس میں فاضل مولف نے ایک سوال کے جواب میں آج کے دور کے اہم اقتصادی مسئلے ---- یعنی انفلیشن کا مسئلہ اور عقد قرض میں اس کے مضر (adverse) اثر کا حل پیش فرمایا تھا۔ موصوف کی اس تحریر میں بعض نکات چونکہ میرے علم کی حد تک درست نہیں تھے لہذا میں نے ان کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک مختصر تحریر میں ان کا جائزہ لیا' جو مذکورہ بالا عنوان ہی کے تحت ماہ اگست کے "حکمت قرآن" میں قارئین کے سامنے آچکی ہے۔

چونکہ میری مذکورہ تحریر میں محترم مولانا صاحب کے نقطہ نظر سے اختلاف اور اس پر خالص علمی انداز میں تنقید کی گئی تھی لہذا مولانا کی جانب سے اپنی رائے کے دفاع میں "جواب آں غزل" لازم تھا۔ الحمد للہ مولانا نے اپنی رائے ایک مضمون کی شکل میں ارسال کردی ہے (جو ماہ نومبر کے حکمت قرآن کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے)۔ مولانا کی یہ نئی تحریر ان کی رائے کے حق میں تازہ دلائل اور میرے اعتراضات کے جواب پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ میری کم علمی اور میری عقل و فہم کی صحت پر شک کا اعلان و اظہار بھی ہے۔ مولانا موصوف سے دست بستہ عرض ہے کہ مجھے اپنے بارے میں آپ کے تبصرے سے کوئی اختلاف نہیں' یقیناً میں کم علم اور نا تجربہ کار ہوں' اس لئے کہ میدان علم میں کوئی مقام بھی انتہائی نہیں اور علم میں اضافہ اور ترقی سے اصل شے جو حاصل ہوتی

ہے وہ اپنی کم علمی کا احساس ہے۔ بلاشبہ کسی کا اپنے علم پر فخر و غرور کسی بھی اعتبار سے پسندیدہ نہیں۔ لیکن مولانا سے اتنا ضرور عرض ہے کہ طویل عرصے سے بحر شریعت میں غواصی کے نتیجے میں جو کچھ وہ نکال کر لا رہے ہیں اور اب اسے جس طرح سے پیش فرما رہے ہیں اسے جدید معاشی علوم سے نابلد افراد تو شاید آسانی سے قبول کر لیں لیکن تعلیم یافتہ افراد کے سامنے اپنی رائے پر ثبوت کے لئے جو approach درکار ہے بدقسمتی سے اسے وہ اختیار نہیں کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے میری اس تحریر اور تبصرے پر مولانا ٹھنڈے دماغ سے غور کریں گے۔

مولانا نے میری تحریر میں بعض ایسے نکات کو زبردستی غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو حقیقت میں بالکل درست ہیں۔ مثلاً میں نے اپنی تحریر میں لکھا تھا "کتب فقہ میں سونے چاندی کو مال حقیقی کی تعریف کے تحت لکھا جاتا ہے۔" اس جملے کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں "اس کے بعد صفحہ ۳۸ پر دوسرے پیراگراف میں بھرتی کے طور پر جو لکھا ہے وہ بے محل بھی ہے اور غلط بھی' کیونکہ اس میں مال حقیقی کا مصداق صرف سونے چاندی کو قرار دیا گیا ہے...." یہاں لفظ "صرف" کا اضافہ کر کے میرے جملے کو جو غلط معنی پہنائے گئے ہیں وہ آسانی سے محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ "کتب فقہ میں سونے چاندی کو مال حقیقی کے تحت لکھا جاتا ہے" سے یہ مراد لینا کہ "مال حقیقی کا مصداق صرف سونے چاندی کو قرار دیا گیا ہے۔" سراسر زیادتی ہے۔

اسی طرح اپنی ماہ اگست کی تحریر میں میں نے لکھا تھا "افراط زر کے علاوہ بہت سے دوسرے اسباب بھی ہیں جو کہ کرنسی کی قدر پر اثر انداز ہوتے ہیں" اس جملے پر تبصرہ فرماتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ "کیا ہی اچھا ہوتا کہ موصوف وہ دوسرے اسباب بتلا دیتے جو مطلق کاغذی کرنسی کی قدر پر اثر انداز ہوتے ہیں' پھر جب افراط زر کے سوا دوسرا کوئی سبب ہے ہی نہیں تو کہاں سے اور کیسے لاتے" مولانا سے دست بستہ عرض ہے کہ اختصار کے پیش نظر میرا کسی بات کا صراحتاً ذکر نہ کرنا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ بات سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جو بات کسی کے علم میں نہ ہو وہ بات مطلقاً موجود ہی نہ ہو۔ انفلیشن کا' جو کہ کرنسی کی قدر میں تبدیلی کا

موجب ہے' زر کی افراط کے علاوہ دیگر کئی وجوہات سے متاثر ہوتا بالکل درست ہے۔ اور اس بات کی قدرے وضاحت ذیل میں کی جارہی ہے۔

اصل موضوع پر آنے سے قبل تصور "انفلیشن" اور "افراط زر" کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ مولانا موصوف کی تحریریں پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ جدید مالیاتی نظام میں کاغذی کرنسی سے متعلق بعض حقائق اور کرنسی کی قدر میں کمی بیشی سے متعلق چند امور کی جانب مولانا کی توجہ نہیں ہے۔

بد قسمتی سے جس شخص نے بھی اولاً انفلیشن کا ترجمہ "افراط زر" سے کردیا اس نے بہت بڑا مغالطہ لوگوں کے ذہنوں میں ڈال دیا۔ اس لئے کہ "افراط زر" سے جس بات کی جانب توجہ فوری جاتی ہے وہ ہے گردش میں زر کی کثرت یا زر کی رسد میں اضافہ۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ افراط زر اور قیمتوں کی سطح میں بلندی ایک ہی بات ہے' اور یہ کہ قیمتوں میں اضافے اور انفلیشن کا اصل سبب (یا واحد سبب) زر کی مقدار میں اضافہ ہے۔ جبکہ صورت واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں تصورات میں بڑا فرق ہے۔ اس کی وضاحت درج ذیل ہے۔

ماہرین معاشیات انفلیشن سے مراد قیمتوں کی عمومی سطح میں بلندی کو لیتے ہیں۔ لیکن چونکہ قیمتوں میں وقتی اتار چڑھاؤ کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہوتا جس سے معاشی صورت حال میں کوئی بنیادی فرق پڑے لہٰذا طویل مدت کے لئے قیمتوں میں اضافے کو ہی قابل توجہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے ماہرین صرف طویل مدت پر محیط قیمتوں کی عمومی سطح میں چڑھاؤ کو ہی انفلیشن گردانتے ہیں۔

انفلیشن کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ جان لینا چاہئے کہ اس کا اصل سبب طلب کی رسد پر زیادتی ہے۔ اس لئے کہ آبادی میں وسائل اور پیداوار کی نسبت زیادہ اضافہ سے انفلیشن ہوتا ہے۔ لوگوں کے رجحان طلب میں تبدیلی سے بھی انفلیشن ہوتا ہے۔ اشیاء کی پیداواری لاگت میں اضافہ بھی انفلیشن کا سبب ہے۔ آج کے دور میں حکومتوں کے بجٹ کے خسارے اور بین الاقوامی ادائیگیوں کے توازن میں بگاڑ انفلیشن کا سب سے بڑا سبب ہیں۔ اس لئے کہ ان کے خساروں کو پورا کرنے کے لئے یا تو ٹیکسوں کا

سہارا لیا جاتا ہے یا قرضوں سے مدد لی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں بڑا Inflationary اثر رکھتے ہیں۔ مندرجہ بالا تمام اسباب طلب و رسد میں تفاوت ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔

زر کی رسد میں اضافہ یا گردش میں کرنسی میں اضافہ بھی انفلیشن کا ایک سبب ہو سکتا ہے۔ "ہو سکتا" اس لئے لکھا ہے کہ اس سبب سے انفلیشن صرف اسی وقت ممکن ہے کہ جب زر کی رسد میں اضافہ اشیاء کی رسد میں اضافے سے نسبتاً زیادہ ہو۔ یعنی ایسی صورت کہ جب زر کی رسد میں مثلاً تین فیصد اضافہ ہوا ہو جبکہ اشیاء کی رسد میں پانچ فیصد اضافہ ہو تو باوجود زر کی رسد میں اضافے کے قیمتوں میں کمی کا رجحان متوقع ہو گا۔ ذرا سا غور کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ اس سبب سے انفلیشن کے ہونے کے پیچھے بھی طلب و رسد کا تفاوت کار فرما نظر آتا ہے۔

انفلیشن اور افراط زر کی مندرجہ بالا توضیح کے بعد اب یہ حقیقت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگر ملک میں کاغذی کرنسی کے بجائے سونے چاندی کے درہم و دینار رائج کر دیئے جائیں تب بھی طلب و رسد کی مذکورہ اساسات کی بناپر اشیاء کی قیمتیں اوپر کی جانب مائل ہوں گی۔ گویا کہ انفلیشن ہو گا۔ اور جتنا طلب و رسد میں فرق بڑھے گا اتنا ہی انفلیشن زیادہ ہو گا۔ ایسی صورت میں انفلیشن سے سونے کے سکے کی مالیت میں کمی لازمی بات ہے۔ اس لئے کہ پہلے اگر مثلاً ایک درہم سے پانچ اشیاء خریدی جاسکتی تھیں تو اب قیمتیں چڑھنے سے ایک درہم کی صرف چار اشیاء خریدنا ممکن ہو گا۔ گویا پہلے پانچ اشیاء کے عوض ایک درہم ملتا تھا تو اب چار اشیاء سے ہی مل جاتا ہے یعنی درہم' in terms of commodities اب سستا ہو گیا ہے۔ درہم کا یہ سستا ہو جانا اس کی مالیت یا قوت خرید میں کمی ہو جانا ہی تو ہے!

اور یہ بات بھی اصلاح طلب ہے کہ سونے چاندی کے سکوں پر افراط زر کا اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اگر تو ملک میں سونے چاندی کے سکے رائج ہیں اور ان کی رسد میں اضافہ اگر اشیاء کی رسد میں اضافے سے زیادہ ہو گا تو مذکورہ اصول کی بناپر ان کی مالیت یا قوت خرید میں لازماً کمی ہو گی۔ اور اگر ملک میں کاغذی کرنسی رائج ہے تو ان کی رسد میں

اضافے سے ان اشیاء کی قیمتیں زیادہ بڑھنے کا امکان ہے جن کی طلب زیادہ ہے جبکہ ان اشیاء کی قیمتوں میں کم اضافہ متوقع ہو گا جن کی طلب نسبتاً کم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج مختلف اموال حقیقی کا باہم تناسب مبادلہ بھی وہ نہیں ہے جو پرانے دور میں تھا۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے قتل کی دیت کی مثال نہایت مناسب ہے۔ آنحضور ؐ نے قتل کی دیت اونٹوں میں ایک سو اونٹ' سونے چاندی میں ایک ہزار دینار اور دس ہزار درہم بالترتیب مقرر کی تھی۔ گویا اس دور کے اعتبار سے یہ تینوں اشیاء تقریباً ہم قیمت اور ہم مالیت تھیں۔ جبکہ آج کل کی قیمتوں کے اعتبار سے ان اشیاء کی مالیت کا اندازہ لگایا جائے تو سو اونٹوں کے مقابلے میں دس ہزار درہم کی قیمت اندازاً ۱/۷ رہ گئی ہے۔ اسی طرح سونے اور چاندی کی باہمی قیمتوں میں جو تفاوت دور نبویؐ سے پیدا ہو چکا ہے وہ بھی بہت بڑا اور نمایاں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ افلیشن کو بنیاد بنا کر جو فرق کاغذی کرنسی اور درہم و دینار کی کرنسی میں پیدا کیا جا رہا ہے وہ بالکل غیر ضروری ہے۔

اب آیئے کہ اصل مسئلہ یعنی سونے چاندی کی کرنسی اور کاغذی کرنسی کے مابین فرق اور مماثلت پر قدرے تفصیل سے نظر ڈال لی جائے۔ جیسا کہ میں نے ماہ اگست کی تحریر میں ذکر کیا تھا کہ میری رائے ان اصحاب کی رائے کے موافق ہے جن کا خیال یہ ہے کہ کاغذی کرنسی عملی طور پر وہ تمام functions ادا کر رہی ہے جو درہم و دینار کرتے تھے' لہٰذا یہ درست نہیں ہے کہ ہم جنس کاغذی کرنسی کے لین دین میں' چاہے وہ قرض کی صورت میں ہو یا بیع کی صورت میں' عددی یا مقداری اعتبار سے معاہداتی بنیاد پر زائد لیا' دیا جائے۔

مندرجہ بالا نظریہ کی تائید میں قدیم اور معاصر علماء کے متعدد اقوال موجود ہیں۔ معاصر علماء رائج کرنسی کو مکمل طور پر درہم و دینار کے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ ادارہ معارف اسلامی کے تحت شائع ہونے والی علامہ یوسف القرضاوی کی معرکتہ الاراء تصنیف "فقہ الزکاۃ" میں تحریر ہے :

"صورت حال یہ ہے کہ یہ نوٹ لوگوں میں معاملات کی اساس بن چکے ہیں اور

اب سونے اور چاندی کے سکوں کو وہ دیکھ بھی نہیں پاتے۔ اگر ہوتے بھی ہیں تو معمولی مقدار میں ہوتے ہیں۔ اب معاملات اور ثروت کی اساس یہی کاغذی نوٹ بن چکے ہیں۔ قانونی اداروں کے اعتماد اور معاملات کی خوش اسلوبی سے روانی کی بنا پر یہ کاغذی نوٹ ہی اشیاء کی قیمت قرار پاچکے ہیں۔ غرض ان کاغذی نوٹوں کو ضروریات پورا کرنے، تبادلہ کرنے اور کسب معاش و منافع میں وہی قوت حاصل ہے جو سونے اور چاندی کی قوت ہوتی ہے اور اس لحاظ سے کاغذی نوٹ سونے اور چاندی کی طرح افزائش پذیر اور اموال نامیہ ہیں" {۱}

فاضل مولف نے اپنی ایک دوسری تالیف "ربا اور بینک کا سود" میں بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے {۲}۔

مطبع المنار مصر سے شائع ہونے والی علامہ رشید رضا کی تصنیف "یسر الاسلام واصول التشریح" میں فاضل مصنف نے کاغذی نوٹوں کو مستقل کرنسی قرار دیا ہے جس میں ربا کے تمام احکام جاری ہوتے ہیں۔ {۲}

میمن اسلامک پبلشرز کے زیر اہتمام شائع ہونے والی مولانا تقی عثمانی کی تصنیف "کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم" میں صاحب تالیف نے تفصیل کے ساتھ کرنسی نوٹوں کی ثمنیت اور ان پر مرتب ہونے والے فقہی احکام کا جائزہ لیا ہے اور انہیں فقہی احکام کے اعتبار سے سونے اور چاندی کے مشابہ قرار دیا ہے {۳}

اسی طرح ڈاکٹر وھبہ الزحیلی اپنی تصنیف "الفقہ الاسلامی فی اسلوبہ الحدید" جلد اول صفحہ ۶۱۸ میں لکھتے ہیں :

> "شرکت کے درست ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا سرمایہ درہم و دینار یا مروج کرنسی نوٹوں کی شکل میں ہو"۔

گویا عملی مقاصد کے اعتبار سے دونوں کی حیثیت یکساں ہے۔

فقہاء متقدمین میں سے امام ابن تیمیہؒ کا ایک قول درہم و دینار کے بارے میں ملتا ہے جسے ادارات البحوث العلمیہ والافتاء کے ایک فتوی میں نقل کیا گیا ہے :

> "درہم و دینار کی اپنی ذاتی اور شرعی حیثیت کوئی نہیں۔ ان کا ثمن ہونا دراصل عرف و عادت کی وجہ سے ہے۔ درہم و دینار اپنی ذات میں مطلوب و مقصود نہیں بلکہ لوگوں کے مالی معاملات کے لئے ایک معیار ہیں اور وسیلہ اپنی ذات میں مقصود

ومطلوب نہیں ہوتا۔{۵}"

امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کی رائے میں اگر چمڑا کرنسی بن جائے تو اس میں بھی ربا اور صرف کے وہی احکام جاری ہوں گے جو درہم و دینار میں ہوتے ہیں۔ المدونۃ الکبرٰی میں تحریر ہے :

"لوان الناس اجازو بینھم الجلود حتی یکون لھا سکۃ وعین لکرئتھا ان تباع بالذھب والورق نظرۃ"۔{۶}

کاغذی کرنسی اور سونے چاندی کی کرنسی کے تمام عملی مقاصد کے لئے مکمل مشابہ ہونے پر علماء امت کا اجماع ہو چکا ہے۔ اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے ۱۹۸۶ء میں درج ذیل قرارداد منظور کی :

"کاغذی نوٹ فقہی اعتبار سے نقود اعتباریہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں ثمنیت مکمل طور پر موجود ہے۔ شریعت میں ربا' زکوٰۃ' سلم وغیرہ کے معاملے میں سونے اور چاندی کے جو احکام طے شدہ ہیں وہی احکام ان نوٹوں پر بھی جاری ہوں گے"۔{۷}

اسلامی ترقیاتی بینک جدہ میں منعقدہ سیمینار میں ۱۹۸۷ء میں درج ذیل قرارداد منظور کی گئی :

"کرنسی نوٹ اس اعتبار سے سونے چاندی کے سکوں کی جگہ ہیں کہ ان میں سود' زکوٰۃ اور سلم کے احکام جاری ہوتے ہیں"{۸}

مندرجہ بالا تصریحات اور آراء کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کاغذی کرنسی اور سونے چاندی کی کرنسی کی مد میں عملی اعتبار سے مال حقیقی اور مال حکمی کی تفریق کی کوئی اہمیت نہیں۔ لہٰذا اس بات پر اصرار کہ چونکہ کاغذی کرنسی مال حکمی کی تعریف میں آتی ہے' اس لئے قرض کی واپسی میں انفلیشن کو مدنظر رکھنا اور اسے سونے کی قیمت (چونکہ سونا مال حقیقی ہے) سے منسلک کر دینا چاہئے' غیر موزوں بھی ہے اور خلاف اجماع امت بھی۔

دوسرا اہم مسئلہ جو کہ اگرچہ اوپر کی گئی بحث سے براہ راست متعلق ہے لیکن اپنی ذات میں ایک مستقل موضوع بھی ہے وہ قرضوں کی واپسی میں برابری کے اعتبار سے ہم

مثل یا ہم قیمت ہونے کا مسئلہ ہے۔ میں نے اپنی پچھلی تحریر میں ذکر کیا تھا کہ قرض پر لئے گئے اور دیئے گئے مال کا مکمل ہم قدر یا ہم مثل ہونا نظری طور پر ممکن نہیں ہے۔ یہاں ظاہر ہے کہ "ہم مثل" سے میری مراد قیمت اور قدر میں ہم مثل ہونا تھی۔ اس لئے کہ ناپ' تول' وزن اور عدل میں ہم مثل ہونے کی توضیح تو اسی تحریر میں صفحہ ۴۰ پر کر دی گئی تھی۔ البتہ محترم مولانا نے اپنی موجودہ تحریر میں میری اس بات کا خاکہ اڑانے کے بعد بالآخر یہ لکھ کر کہ "..... پھر اگر رؤس اموال کا لین دین گن کر تعداد کے حساب سے ہوتا ہو تو مثل سے مراد تعداد میں برابری' اور اگر ماپ تول سے ہوتا ہو تو مثل سے مراد ماپ تول میں مساوات قرار پاتا ہے" میری ہی بات اور رائے کی تائید کر دی۔ فللہ الحمد۔

حقیقت یہ ہے کہ فقہاء کے ہاں اس مسئلہ میں کوئی ابہام نہیں ہے کہ "مثل" اصلاً ناپ' تعداد' وزن اور مقدار میں مساوات و برابری ہے۔ اس ضمن میں حدیث کے الفاظ "الجید والردی فیہ سواء" بالکل واضح اور معین ہیں۔ کاغذی کرنسی کو اس قاعدے کلئے سے مستثنیٰ رکھنے کے لئے کوئی نص دلیل بھی میسر نہیں۔ جمہور فقہا کا مسلک ہے کہ کوئی بھی بقایا یا قرض ہو اسے جوں کا توں لوٹانا چاہئے جب تک کہ وہ سکہ چلن میں ہو یا اس کے ذریعے ادائیگی ممکن ہو۔ ابن قدامہ کے مطابق : "المستقرض یرد المثل فی المثلیات' سواء' رخص سعرہ اوغلی اوکان بحالہ" مقروض مثلیات میں مثل لوٹائے گا' چاہے اس کی قیمت کم ہو جائے یا زیادہ یا سابقہ قیمت برقرار رہے [۹]۔ ظاہر ہے کاغذی کرنسی بھی مثلی ہے تبھی تو اس کا قرض پر دینا ممکن ہے۔ ابن عابدین لکھتے ہیں : واجمعوا ان الفلوس اذالم تکسد ولکن غلت قیمتھا اورخصت فعلیہ مثل ماقبض من العدد [۱۰]۔ واضح رہے کہ "فلوس" اس دور میں دھاتوں کے وہ سکے تھے جو اپنی بے وقعتی کے علاوہ قانونی زر ہونے کی صفت سے بھی محروم تھے۔ مزید براں ان کے وزن میں یکسانیت بھی مفقود تھی۔ بعض اوقات ایک صوبے کے مختلف شہروں میں الگ الگ وزنوں کے فلوس چلتے تھے۔ [۱۱] ابن عابدین کے مطابق (اس دور کے) فقہا اس بارے میں متفق ہیں کہ سکوں کی قیمت متروک ہوئے بغیر گھٹ یا بڑھ جائے تو مقروض کو وہی تعداد لوٹانی ہوگی جو اس نے قرض لی

تھی۔ گویا کہ "فلوس" جو کہ بنیادی طور پر قانونی نقدی نہیں تھی' ان کے بارے میں بھی قدیم فقہاء نے نقود اصلی والا حکم لگایا ہے --- آج کی کاغذی کرنسی کا معاملہ تو اس سے بہت آگے کا ہے' اس لئے کہ یہ قانونی زر ہونے کے جملہ تقاضے پورا کرتی ہے۔

مولانا تقی عثمانی "کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم" میں لکھتے ہیں :

"قرآن و سنت کے دلائل میں غور کرنے اور لوگوں کے معاملات کا مشاہدہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرضوں کی واپسی میں جو برابری شریعت میں مطلوب ہے وہ مقدار و کیت میں مطلوب ہے قیمت و مالیت میں مطلوب نہیں"۔ {۱۲}

مسئلہ ہذا میں اجماع امت کے انداز میں اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ بعنوان "ملکی معیشت سے سود کا خاتمہ" میں بھی اسی رائے کا اظہار کیا گیا ہے :

"جہاں تک کوئی چیز ادھار دینے اور لینے کا تعلق ہے شریعت کے مطابق نقدی کی صورت میں لین دین اور جنس کی صورت میں لین دین کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ شریعت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ کسی چیز کی جو مقدار ادھار لی گئی ہے وہی مقدار واپس کی جائے گی۔ خواہ اس عرصہ میں اس کی قیمت میں کتنا ہی تغیر واقع ہو چکا ہو۔ مثلاً اگر ایک من گندم ادھار لی گئی تو قرض دار کو گندم کی اتنی ہی مقدار واپس کرنی ہو گی خواہ اس کی قیمت تیس روپے سے بڑھ کر پچاس روپے من ہو گئی ہو یا گھٹ کر پندرہ روپے من رہ گئی ہو۔ اسی طرح اگر نقدی کی خاص مقدار قرض لی گئی ہو مثلاً ایک ہزار روپے تو قرض دار کو ایک ہزار روپیہ ہی واپس کرنا ہو گا خواہ اس عرصہ میں دوسری اجناس اور خدمات کی نسبت سے روپے کی قیمت میں کتنی ہی تبدیلی آچکی ہو"۔ {۱۳}

اس معاملہ میں اجماع امت کا ایک اور مظہر اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور I.I.I.E اسلام آباد کے زیر اہتمام انڈیکسیشن کے موضوع پر منعقدہ سیمینار ۱۹۸۷ء کی وہ رپورٹ ہے جس میں میں کہا گیا ہے کہ :

ربا اور قرض کی احادیث میں مذکور یکسانیت اور مساوات سے وزن' پیمائش اور مقدار کی مساوات مراد ہے' مالیت کی برابری مراد نہیں۔ یہ بات متعلقہ احادیث سے بھی ظاہر ہے جن میں اموال ربویہ کے لین دین میں ان کی قدر (Value) کو مد نظر نہیں رکھا جاتا۔ اس نکتہ پر امت کا اجماع ہے اور اس پر اسی طرح عمل ہوتا

چلا آرہا ہے۔[۱۴]

ان آراء اور فتاویٰ کی موجودگی میں اور انفلیشن اور افراط زر' اور کاغذی اور دھاتی کرنسی کے فرق و مماثلت کی مندرجہ بالا تصریحات کے پیش نظر یہ بات کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ مولانا موصوف اپنے علمی مقام و مرتبے کے علی الرغم مسئلہ ہذا میں اجماع امت کے برعکس رائے رکھتے ہیں۔ امید کی جانی چاہئے کہ وہ اس معاملہ میں اپنی رائے پر نظرثانی فرمائیں گے۔

جہاں تک قرض خواہ کے ساتھ عدل و انصاف کے تقاضے کا معاملہ ہے' تو واقعہ یہ ہے کہ قرض خواہ کو بہت سے لازمی یا ممکنہ نوعیت کے نقصانات برداشت کرنا ہی ہوتے ہیں' جن کی تفصیل میری ماہِ اگست کی تحریر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو بھی اپنے مال سے وقتی طور پر ہاتھ دھونا تو لازم ہے۔ یہ مال اگر وہ خود استعمال کرتا تو اس سے کچھ کما سکتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قرض خواہ پر لازم کر دیا کہ اس قسم کے جملہ نقصانات و اخراجات کو بہرحال برداشت کرے۔ اس کے بالمقابل اس کے اس عمل کو اجر و ثواب کا موجب قرار دیا گیا' اس لئے کہ یہ کسی حاجت مند کی حاجت کو پورا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ گویا یہ بنیادی طور پر ایک غیر مادی فعل ہے اور ایثار و قربانی کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ لہٰذا اس میں قدر یا قوت خرید جیسے مادی مقتضیات کو شامل کرنا اس کی اصل روح کے منافی ہے۔

اور اگر کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ اس کا مال قرض دینے کی صورت میں کم قیمت ہو جائے' تو شریعت میں شراکت و مضاربت اور بیع سلم و بیع موجل وغیرہ کی صورت میں راستے کھلے ہیں جن کے ذریعے سے مال کی وقتی تملیک یا مکمل تملیک کی مختلف صورتوں پر عمل کر کے ضرورت رسانی کی جا سکتی ہے۔ ان امور کی وضاحت ان شاء اللہ کسی اور موقع پر کی جائے گی۔

اور اس کے بعد بھی اگر اس پر اصرار ہو کہ مال حقیقی اور مال حکمی کے فرق کی بنا پر معاملہ قرض میں انفلیشن کی صورت میں قرض خواہ کو کسی مال حقیقی کا اعتبار کر کے اس کی رقم پر زائد دیا جانا چاہئے تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ آخر سونا چاندی انسان کی وہ کونسی ضرورت پوری کرتے ہیں جو روپیہ پیسہ نہیں کر سکتے۔ نہ تو ان سے براہ راست

پیٹ بھرا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ بدن ڈھانپنے کے کام آسکتے ہیں۔ رہ گیا سوال زیب و زیبائش کا تو یہ ضرورت نوٹوں کے ہار بھی کسی نہ کسی اعتبار سے پوری کر ہی رہے ہیں۔

اب چند سطروں میں مولانا صاحب کی پیش کردہ تجویز' یعنی سونے چاندی کا اعتبار کر کے قرض خواہ کو قرض کی رقم کی واپسی کے بعض عملی نتائج و عواقب کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ بالفرض اگر تمام پیش کردہ دلائل سے صرف نظر کر کے مولانا کی تجویز کو مان ہی لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ :

۱۔ لوگ مال حقیقی کے ساتھ الحاق میں صرف سونے چاندی تک ہی محدود نہیں رہیں گے۔

۲۔ لوگ قرض دیتے وقت ان اموال حقیقی سے قرض کی مالیت کو جوڑنے لگیں گے جن کی قیمتیں تیزی سے بلندی کی جانب مائل ہیں۔

۳۔ بعض حضرات کسی ایک شے سے قرض کو منسلک کریں گے اور بعض دوسری سے۔ نتیجتاً کوئی یکساں نظام رائج نہیں رہے گا۔

۴۔ بینکوں کو لوگوں سے قرضہ لینے کے لئے اچھی دلیل مل جائے گی اور مختلف اموال حقیقی سے قرضوں کے الحاق کو بنیاد بنا کر وہ اچھی attractive investment schemes میں مسابقت شروع کر دیں گے۔ نتیجتاً قرض حسنہ جیسے نیکی کے کام میں مادی منفعت کی الائش پیدا ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین!

حوالہ جات

{۱} "فقہ الزکاۃ" از علامہ یوسف القرضاوی' جلد ۲' ص ۵۱ (بحوالہ فکر و نظر' اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۵ء)

{۲} ڈاکٹر یوسف القرضاوی "رباو ربینک" کا سود (اردو ترجمہ IBS اسلام آباد' ص ۴۰ تا ۴۲

{۳} "یسر الاسلام واصول التشریع" از علامہ رشید رضا ص ۶۱

{۴} "کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم" از مولانا تقی عثمانی' ص ۲۷

{۵} "الورق النقدی' از عبداللہ بن سلیمان' اشاعت دوم' ص ۱۳۴